ڈاکٹر روِش ندیم
استادشعبہ اردو، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد

آزاد نظم: تعارف، تاریخ اور صورتحال

Dr Ravish Nadeem

Department of Urdu, International Islamic University, Islamabad

Free Verse: Introduction, History and Current Situation

Free verse is a new and modern form of poetry even in Urdu. It is a reaction of traditional and classical forms and determination of poetry. But in our society it is still unpopular due to prevailing situation of pro-classic tendency in social, literary and educational institutions.

گو عالمی تاریخی ارتقا کے تناظر میں ہندستان اکبر اعظم کے عہد میں ہی ازمنہ وسطیٰ کی حدیں پھلانگ چکا تھا لیکن جدید تاریخ کا باقاعدہ آغاز انیسویں صدی میں متشکل ہوتا نظر آتا ہے جس کی زمانی حد بندی کے عمومی اظہار کے لئے ۱۸۵۷ء کو بطور علامت استعمال کیا جاتا ہے۔ اکبر اعظم سے بہادر شاہ ظفر تک کا یہی وہ زمانہ ہے جب اردو زبان نے اپنے ادب کی باقاعدہ تشکیل کی۔ اردو زبان کا ادب کلاسیکی دور میں شاعری پر مشتمل رہا جس کا سنہری دور اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد ابھرنے والے ہمہ گیر زوال کا بھی نمائندہ بھی بنا۔ یہ ادب اپنی بنیاد میں ازمنہ وسطیٰ کے فارسی ادب کے زیر سایہ پروان چڑھا۔ حملہ آور فارسی بادشاہت، ان کے وسطی ایشیا و ایران کے ساتھ مسلسل ذہنی و ثقافتی روابط، زرعی معاشرت، تصوف و نو فلاطونیت کی بنیاد پر ازمنہ وسطیٰ کے ہندستان کے تاریخی تسلسل نے شاعری کے حامل اردو ادب کو مخصوص موضوعاتی و ہیئتی بنیادیں فراہم کیں۔

اس عہد کی زرعی حوالے سے فطرت کی مطابقت میں مرتب شدہ سیدھی سادی سماجی تنظیم نے عہد وسطیٰ کے ادبی پیرائے کے مخصوص مزاج، موضوع، لہجے اور اسلوب کو داخلی و خارجی سطح پر متاثر کیا۔ اس دور کی شعری مادر صنف (Mother form) غزل تھی۔ کم و بیش تمام شعری اصناف اسی کا ہیئتی تسلسل تھیں حتیٰ کہ اس کی نظم بھی جو کہ غزل کے علاوہ دیگر تمام شعری اصناف مثلاً قطعہ، رباعی، واسوخت، ریختی، شہر آشوب، قصیدہ، مثنوی مرثیہ وغیرہ پر مشتمل تھی۔ یہ کلاسیکی نظم نگاری بھی غزل کی طرح کلاسیکی ہیئتی پابندیوں کی حامل تھی حتیٰ کہ ردیف قافیہ تک کو ناگزیر ضابطے کے طور پر قبول کیا جاتا تھا۔ یہ روایتی نظم نگاری ہیئت کے ساتھ ساتھ اپنے موضوعات کی بھی پابند ہوتی تھیں۔

اردو شاعری میں تجربے کی روایت ۱۸۵۷ء سے پہلے فارسی یا کسی حد تک عربی اور ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزی یا کسی حد تک علاقائی ادب سے لی گئی ہیئتوں پر مشتمل ہے۔ انگریزی ادب کے تحت اردو شاعری میں ہیئتوں کے تجربات کو اگر جدید نظم نگاری کا مجموعی نام ہی دے دیا جائے تو بھی کافی ہے۔ کیونکہ جدید شاعری کے اولین اور دیگر تمام تر ہیئتی تجربات اردو نظم کے

ضمن ہی میں ہوئے۔جس کی ابتدا محمد حسین آزاد سے ہوئی۔گونظیر اکبر آبادی کی مخمس و مسدس وغیرہ جیسی ہیئتوں پر مشتمل گوناگوں موضوعات کی حامل نظم نگاری بدلتے ہوئے ہندستانی سماج کا پتہ دیتی ہے مگر ۱۸۵۷ء کے بعد نئے سماجی سیاسی نوآبادیاتی حالات اوران میں ابھرنے والی سرسید تحریک، ایسے میں نوآبادیاتی حکمرانوں کے کرنل ہالرائڈ کے ذریعے تعلیم وادب کے لئے اقدامات :اس صورت حال میں آزاد کا انجمن پنجاب کا ۱۸۶۷ء والا خطبہ بعنوان ''خیالات نظم اور کلام موزوں کے باب میں'' پڑھنا اور پھر جدید نظم کی تقریب تاسیس اورمئی ۱۸۷۴ء کا مشاعرہ اور نئے انداز کی مثنوی شب قدر پڑھنا وغیرہ اردو شاعری میں ایک بڑے انقلاب کا آغاز تھا۔اسی لئے آزاد کے شاگرد اور نظم دلفروز (مجموعہ نظم آزاد) کے مرتب سید ممتاز علی نے اس کے دیباچے میں لکھا کہ ''یہ پہلا دن تھا جس روز ہمارے ملک کی نئی شاعری کی پہلی اینٹ رکھی گئی۔''[۱] الطاف حسین حالی اس تبدیلی کا انتہائی اہم کردار تھے کہ انہوں نے اپنے مقدمہ شعروشاعری میں فری ورس اور بلینک ورس کے لئے ذہن تیار کیا۔ گوحالی نے مقدمہ میں شاعری کی بحث میں جس اجتہاد سے کام لیا اس کا مکمل اظہار وہ اپنی نظم میں نہیں کر سکے۔فکری سطح پر حالی کا مقدمہ شعروشاعری اور آزاد کا انجمن پنجاب کے تحت نیا شعری منشور اردو شعروادب کا نیا شعور اور ان کی نظم نگاری ردیف، قافیہ، ارکان اور موضوع کی پابندیوں کے باوجود جدید اردو نظم کی اہم کڑی ہیں۔انہوں نے ادب میں تبدیلی کا شعور دے کر نئے ادبی تجربات کے لئے میدان صاف کیا۔مثلاً حالی کے شاگرد برج موہن دتاتریہ کیفی نیا پنی کتاب واردات میں ۱۸۸۷ء میں غیر مقفی نظم (بلینک ورس) بعنوان ''ملکہ وکٹوریہ کی گولڈن جوبلی ۱۸۸۷ء پر'' لکھ کر انگریزی طرز پر کہی گئی اولین نظم کا دعوٰی بھی کیا۔[۲] ۱۸۹۷ء میں نظم طباطبائی نے گورغریباں کے نام سے سٹینز افارم کی طرز پر سب سے پہلی نظم لکھ کر عبدالحلیم شرر کے رسالے دلگداز میں چھپوائی۔اسی رسالے میں ایسا ہی تجربہ ظفر علی خان نے ۱۹۰۱ء میں کیا۔ان سمیت یلدرم اور وحید الدین سلیم جیسے لوگوں نے اردو شاعری میں تجربوں کا باقاعدہ آغاز کیا۔اسی دور میں سر عبدالقادر کے مخزن نے اردو میں انگریزی نظموں کے منظوم تراجم کو مقبول کرنے میں اہم کردار کیا جن کے اثرات بہت دور تک آئے۔گولڈ سمتھ نے شیکسپیئر کی شاعری کے اردو نثری ترجمے بہت پہلے لکھ دئے تھے مگر بیسویں صدی کے آغاز میں مخزن و دلگداز کے دور میں ہی ٹیگور کے منثور ترجموں سے نثری شاعری کو مقبولیت ملنے لگی۔۱۹۲۹ء میں تو جرمن شاعر رلکے کی نظم کا نثری ترجمہ بھی کر دیا گیا۔اردو شاعری میں ہیئتی تجربات پابند نظموں میں بحر کے استعمال اور بندوں کی ساخت میں بھی ہونے لگے۔اس کی پہلی مثال عبدالرحمٰن بجنوری کی نظم ''نٹ راجا'' تھی۔اس کے بعد احمد ندیم قاسمی، اختر شیرانی، حفیظ جالندھری، احسان دانش، وغیرہ نے کئی تجربات کئے۔

۱۸۵۷ء کے بعد کا برٹش انڈیا نوآبادیاتی سماج داخلی و خارجی سطح پر ایک پیچیدہ بنت کا حامل تھا۔نئی زندگی قدیم جاگیردارانہ نوفلاطونیت اور مشاہدہ حیات کی دروں بیں اساس کی بجائے جدید علوم کی مہیا کردہ تعقل پسند فکری اساس، حقیقت پسندی اور خارجیت سے عبارت تھی اور نئے عہد کی سماجی سیاسی صورت حال نے شعری اظہار کا رخ غزل سے نظم کی طرف موڑتے ہوئے عہد وسطی کا پیرائیہ اظہار، مخصوص مزاج، لہجہ، موضوع، اسلوب وغیرہ سے بغاوت کا آغاز کیا۔آزاد، حالی، اکبر، اقبال اور ترقی پسند جدید نظم نگاری کے دور اول کے سنگ میل ثابت ہوئے۔اس حوالے سے اکبر ہوں یا اقبال، اختر شیرانی ہوں یا ترقی پسند شعراء سب بدلتے ہوئے سماج کے زیر اثر شعری اظہار میں نظم کی تبدیلیوں کا تسلسل ہیں۔حالی و آزاد کی نظم سے اقبال اور ترقی پسندوں کی نظم تک کا شعری تغیر نظم کا وہ ابتدائی دور تھا جس نے عہد وسطی کی نظم کے ہیئتی جبر کو توڑ دیا۔اقبال نے پابند نظم کو جو عروج دیا اور روایتی تلمیحات، استعاروں اور علامتوں کو جو معنوی وسعت وجدت دی اس کی حیثیت تکملہ کے طور پر وہی تھی جو غالب نے غزل میں کی تھی گویا اقبال نے نظیر و حالی کے جدید نظم کے سفر کو مکمل کیا۔

ہمارے ہاں آزاد نظم انگریزی سے اور انگریزی میں فرانسیسی سے آئی۔اسے انگریزی میں Free Verse (فری ورس) اور فرانسیسی میں Vers Libre (ویرلیبر) کہتے ہیں۔فرانس میں وکٹر ہیوگو کے آغاز کردہ مروجہ

عروضی اصولوں سے انحراف و انقطاع کے آغاز کے بعد ۱۸۸۶ء کی علامت نگاری کی تحریک کے تحت اس کی ترویج ہوئی۔ بادلیئراوراس کے مقلدین رامبوخاص طور پر میلارمے کے پیروکار ''ویرلیبرسٹ'' (Vers-Libristes) کہلائے۔ کلاسیکی اورقدیم شعری اصولوں کی سخت گیری سے بیزاری اور نئے دور کی رفتار سے ہم آہنگی کے لئے بلاروک ٹوک اظہار کے اس نئے پیرائیوں کی تلاش نے آزادنظم کی طرف راغب کیا۔انگریزی ادب میں ٹی ای ہیوم (جس کے ساتھ ایزرا پاؤنڈ کا بھی تعلق تھا) نے نئی شعری ہئیت کی ضرورت کے تحت اپنے ۱۹۱۲ء کے ایک لیکچر کے ذریعے نئے خیالات کا اظہار کیا کہ ہر نئے عہد میں نئی ہئیت کی ایجاد ہی شاعری کو زندگی عطا کرتی ہے۔اس کے خیال میں صداقت مطلق نہیں بلکہ اضافی ہے۔شاعری کی صفت دروبینی ہے جو شاعر کی ذہنی لمحاتی مگر مبہم کیفیات کا ابلاغ کرتی ہے۔ ویرلیبراوراس کے ساتھ آئے تازہ استعارے نے شاعرکو نیاراستہ اور قاری کو نئی بیداری عطا کی۔۱۹۰۹ء میں ہیوم نے اپنے خیالات کی بنیاد پر امیجزم کی تحریک کا آغاز کیا جس نے آزادنظم کو مقبول بنایا۔المختصر ۱۹ویں صدی کی آخری دہائی میں فرانس میں نظم ایک عروضی اصولوں کے تحت لکھی جارہی تھی۔ بعدازاں قدیم عروضی اصولوں سے انحراف کرکے اپنی پسند اور ضرورت کے تحت فرانسیسی زبان میں لکھی جانے والی نظموں کو Vers Libre کہا جانے لگا۔انگریزی شاعری میں Vers Libre یا Free Verse اسے قرار دیا جاتا ہے جو عروض کے قدیم اصولوں کو نظرانداز کرکے غیرمساوی مصرعوں کے تحت کی جاتی ہے۔ جومختلف اوزان کے مصرعوں سے مزین ہوتی ہے یاپھر وزن و بحر سے بالکل ہی عاری ہوتی ہے اور عموماً قافیے کا اہتمام نہیں ہوتا۔

ڈکشنری آف ورلڈ لٹریری ٹرمز کے مطابق: فری ورس

"A pattern of verse structure without metre and usually without rhyme."[۲]

اورایل ایس ہیرس کے مطابق:

> Vers Libre (Free Verse): A term loosely applied to verse in which different metres are mixed, or to anykind of verse in which traditional metre and form are discarted.[۳]

جبکہ ڈکشنری آف لٹریری ٹرمز اینڈ لٹریری تھیوری کے مطابق:

> ... new metrical forms and modifications of traditional ones....it abandoned certain traditional principles; especially the rules which prescribed recurrent metrical patterns and a certain number of syllables per line. Rhythm, and the division of verse into rhythmical units, was held to be personal, the particular expression of hte individual poet...it has no regular meter or line length and depends on natural speech rhythms.[۴]

مندرجہ بالاتعریفوں سے آزادنظم کے حوالے سے دو باتیں سامنے آتی ہیں: اول۔اس میں مختلف بحروں کا امتزاج ہوتا ہے، دوم۔ یہ وزن و بحر سے مکمل طور پر عاری ہوتی ہے۔ گویا فری ورس بطور نثری نظم کے نثر و نظم کی ایک ایسی درمیانی صورت ہے جس میں عروض کے مصنوعی آہنگ کو توڑ کر گفتگو کے فطری آہنگ کو بنیاد بنایا جاتا ہے۔اس کی تکنیک کی بنیاد غیر مساوی مصرع سازی یعنی مصرعوں یا سطروں کی غیرمعینہ تعداد یا سطروں کی تعداد کی آزادی اور ضرورت وخواہش کے مطابق آہنگ کی تبدیلی ہے۔مگر یہاں عروض سے انحراف تو ہے مگر انقطاع نہیں بلکہ اس کی نئی صورت گری اور وقفوں کا استعمال اوران

کی تنظیم وترتیب کا اہتمام دکھائی دیتا ہے۔

اردو میں آزادنظم کی تین صورتیں پائی جاتی ہیں: (الف) موزوں۔ایسی نظمیں جن میں مصرعے چھوٹے بڑے ہوتے ہیں لیکن نظم قدیم اصناف سخن کی طرح ایک مخصوص وزن کی پابند ہوتی ہے۔(ب) نیم موزوں۔ایسی نظمیں جن میں مصرعے چھوٹے بڑے ہوتے ہیں لیکن پوری نظم میں ایک عروضی وزن کی پابندی بھی نہیں کی جاتی البتہ دو(یا بعض اوقات دو سے زیادہ مماثل عروضی اوزان اس طرح استعمال کیے جاتے ہیں کہ وزن کی حس تسکین پا سکے۔۔۔(ج) غیر موزوں۔نظم آزاد کی تیسری صورت وہ ہے جس میں شعرا نے وزن سے یکسر چھٹکارا حاصل کرنا چاہا۔۔۔آج کل غیر موزوں نظم آزاد کے لیے نثری نظم کی اصطلاح استعمال کی جارہی ہے۔(۵) آج کل اردو میں آزادنظم جس طرح سے رواج پا چکی ہے اس کے تحت یہ Vers Libre یا Free Verse کی طرح نہ تو مختلف بحروں کا امتزاج ہے اور نہ ہی وزن و بحر سے مکمل طور پر عاری ہوتی ہے بلکہ اس کی بنیاد روایتی عروض پر ہے۔آزادنظم میں معریٰ نظم کی سی ردیف قافیہ کی پابندی سے آزادی کے علاوہ ایک بحر کی پابندی کے ساتھ مصرعے چھوٹے بڑے کرنے کی آزادی ہے یعنی مصرعوں میں ارکان کی تعداد کم یا زیادہ ہوسکتی ہے۔بلکہ طویل آزادنظم کے مختلف بندوں ٹکڑوں یا استانزوں کو الگ الگ بحروں میں بھی لکھ سکتے ہیں۔آزادنظم میں بطور اکائی کسی بھی بحر کے بنیادی رکن کی غیر معین تکرار سے مصرعے تشکیل دیے جاتے ہیں جس سے مصرعے چھوٹے یا بڑے ہوتے جاتے ہیں۔شعری حسن یا ضرورت کے تحت کچھ مصرعے ہم وزن بھی ہوسکتے ہیں اور کچھ مصرعوں میں قافیہ بندی بھی ہوسکتی ہے۔ضرورتاً بنیادی رکن کی تخفیف بھی کردی جاتی ہے۔مگر یہ آزادنظم کے لوازم نہیں۔اصل لازمہ رکن کی بنیادی حیثیت اور اس کی تکرار کے ذریعے مختلف مصرعوں کی تشکیل وترتیب ہے۔یہاں یہ یاد رہے کہ مصرعوں کو بلاوجہ توڑنے یا ارکان کی تقسیم کردینے سے آزادنظم نہیں بن جاتی کیونکہ آزادنظم میں مصرعے خیال یا اس کے کسی ٹکڑے کے مطابق چھوٹے بڑے ہوتے چلے جاتے ہیں اس لئے زادنظم کے اعلیٰ فنی تقاضوں کے تحت مصرعے کے آخری رکن میں کسی بھی تبدیلی کے باوجود ہر اگلے نئے مصرعے کے پہلے رکن میں تبدیلی نہیں ہونی چاہیئے۔گویا بہترین فنی صورت یہی ہے کہ ہر نئے مصرعے کی قرأت کے بعد وقفہ آنا چاہیئے۔یہ آزادنظم کی Drafting یا صفحے پر اس کی تحریری پیشکش کا مسئلہ ہے جو مصرعے اور خیال یا اس کے جزو کی نشاندہی کرتے ہوئے وقفوں اور ان کی طوالت کی نشاندہی بھی کرتی ہے۔یعنی مصرعوں کو مناسب اور فطری جگہوں پر توڑنا اور نئے مصرعے کا مناسب جگہ سے آغاز کرنا صفحے پر تحریری پیشکش کی صورت میں قاری کی رہنمائی کے ساتھ ساتھ شاعر کے فنی شعور کا بھی اظہار ہوتا ہے۔گویا مصرعوں کی طوالت میں فرق اور ان کے درمیان وقفے شعری خیال یا اس کے اجزا کا فطری اظہار ہوتے ہوئے آزادنظم کے آہنگ، تاثر اور جمالیاتی ساختیے کا ناگزیر حصہ ہیں۔

آزادنظم دراصل شعر ونثر کی دوئی کے خاتمے کا ایک اعلان بھی ہے اور ایک ایسی صنف کی تلاش کا اظہار بھی یہاں شعر اور نثر ایک ہوسکیں۔اس حوالے سے ن م راشد نے لکھا ہے کہ:

> آزادنظم، غزل کی طرح محض قافیہ پیمائی نہیں ہے نہ ہی اس کی منطق غزل کے اشعار کی منطق کی طرح مربوط منطق ہے۔آزادنظم میں ناول کی سی وحدت بھی دستیاب نہیں ہے۔اسے مختصر افسانے کے قریب قریب کی چیز سمجھا جاسکتا ہے یا کسی حد تک Sketches کے قریب۔نئے قاری کی رہنمائی قدیم شاعری کی تفہیم میں بروئے کار آنے والے کلیوں سے ممکن نہیں۔(۶)

جس طرح اردو غزل نے میر تک آتے آتے ارتقا کے ایک طویل سفر کے بعد اپنی مخصوص ساخت وضع کی تھی، اسی طرح جدید اردو نظم نے بھی غزلیہ ساخت سے ہٹ کر اپنی داخلی وخارجی انفرادیت کی تشکیل کے لئے ارتقا کا سفر شروع کیا۔اردو میں آزادنظم کا آغاز تقریباً ۱۹۲۵ء سے تصدق حسین خالد نے کیا۔تصدق حسین خالد، ن م راشد اور میراجی کی آزادنظم کی صورت

میں ارکان کی پابندی کے ساتھ ساتھ ردیف قافیہ کی پابندی سے انحراف کا عمل شروع ہوا جو لفظیات، موضوعات، اسلوبیات، تکنیک اور معنیات وغیرہ تک پھیلتا چلا گیا اور علامتی، معنوی، استعاراتی، موضوعاتی، لسانی اور انفرادی تجربہ کی سطح پر نئی دنیاؤں کی دریافت و تشکیل کو بنیاد بنایا گیا۔ حالی و آزاد کی پابند نظم سے معریٰ نظم اور پھر آزاد و نثری نظم تک کا یہ سفر مجموعی طور پر جدید نظم نگاری کا دوسرا دور کہلاتا ہے جس میں فیض، ساحر، مجاز، علی سردار جعفری جیسے ترقی پسندوں نے موضوعاتی سطح پر اضافے بھی شامل ہیں۔

تیسرا دور ساٹھ کی دہائی میں ''جدید نظم'' کے مقابلے میں لسانی تشکیلات کی حامل ''نئی نظم'' پر مشتمل ہے۔ اس دور میں یورپ کے جدیدیت، ساختیات اور وجودیت جیسے نئے ادبی، لسانی اور فلسفیانہ نظریات کی بنیاد پر جدید نظم میں داخلی و خارجی سطح پر بنیادی تبدیلیوں کے لئے تنقیدی تصورات سامنے آئے۔ خارجی سطح پر لسانی حوالے سے جدید نظم پر غزل کی فارسیت زدہ زبان کے ان کلاسیکی اثرات کے خلاف شعور دیا گیا جو لسانی حوالے سے ن م راشد تک موجود تھے اور نئی سماجی صورت حال میں متروک ہوتے جا رہے تھے۔ جبکہ داخلی سطح پر موضوعاتی حوالے سے سرسید، اقبال اور ترقی پسندوں کے خارجیت پسند اور اجتماعیت پسند رجحانات کے مقابلے میں انسانی ذات اور باطن کو اہمیت دی گئی۔ اسی رجحان میں ستر کی دہائی میں خارجیت پسند و اجتماعیت پسند ماڈرن رئیلزم کا اضافہ ہوا۔ افتخار جالب، انیس ناگی، جیلانی کامران اور وزیر آغا اس رجحان کے نمائندہ جدید نظم نگار کے طور پر سامنے آئے۔ ان کے علاوہ مجید امجد، قمر جمیل، احمد ہمیش، بعد میں اختر حسین جعفری، عبدالرشید، سرمد صہبائی، احمد شمیم، آفتاب اقبال شمیم، زاہد ڈار، سلیم الرحمان، سعادت سعید، کشور ناہید، فہیم جوزی سمیت کئی جدید نظم نگاروں کا ایک گروہ اسی کی دہائی تک اس رجحان کی نمائندگی کرتا رہا۔ ان میں سے غالب شعراء نے آزاد نظم کی ہئیت کو فروغ دینے میں بنیادی کردار ادا کیا۔

آج کل جدید نظم نگاری کا چوتھا دور جاری ہے۔ اس کا آغاز نوے کی دہائی میں راولپنڈی سے ہوا اور اگلے پندرہ بیس سال میں جدید اور آزاد نظم نگاری کو نئے عہد کا شعری اظہار باور کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس دور میں نئی نسل کے نظم گو شعرا نے نظم کے انفرادی تشخص کو مستحکم کرتے ہوئے تکنیکی، لسانی اور موضوعی سطح پر نت نئے اضافے کئے۔ آزاد نظم کی ہئیت اس دور میں غالب طور پر جدید نظم کی پہچان بن گئی۔ اس دور میں آزاد نظموں کے جتنے مجموعے سامنے آئے شاید پہلے کبھی نہ آئے تھے۔ ان میں سے صرف چند ایک کے نام یہ ہیں: جاوید انور، انوار فطرت، روش ندیم، خلیق الرحمن، داؤد رضوان، علی محمد فرشی، فرخ یار، ارشد معراج، رفیق سندھیلوی، تابش کمال، نصیر احمد ناصر، احسان اکبر، اشکر فاروقی، جاوید فیروز، منصورہ احمد، خاور اعجاز، ڈاکٹر ابرار عمر، پروین طاہر، ثروت زہرا، ذیشان ساحل، ممتاز اطہر، کاشف رضا، وحید احمد، تبریز شمسی، گلزار، ابرار احمد، ثمینہ راجہ، سلمان صدیق، عامر عبداللہ، زاہد امروز وغیرہ

لسانی سطح پر اردو شاعری کے دو اسلوب رائج رہے ہیں؛ اول: کلام غالب جیسا مفرس و معرب اور مرعوب کر دینے والا اور دوم: کلام میر جیسا مقامی لہجہ و زبان کا حامل سادہ اور عام۔ آزاد نظم میں کلام غالب کے لسانی اسلوب کے بڑے نمائندہ ن م راشد اور اختر حسین جعفری ہیں۔ یہ اسلوب آج بھی غزل اور احمد فراز اور افتخار عارف وغیرہ کی آزاد نظموں میں بھی نظر آتا ہے۔ لیکن پچھلے چالیس پچاس سال میں یہ لسانی و اسلوبیاتی ڈھانچہ زوال پذیر ہے۔ دوسرا رجحان جو کلام میر کا ہے اس کے بڑے نمائندہ مجید امجد ہیں۔ گو نوے کی دہائی کے آزاد نظم کے ابھار تک آتے آتے یہی رجحان غالب آتا نظر آتا ہے۔ لیکن پھر بھی آزاد نظم اپنی لسانیاتی اسلوبی انفرادیت کے لئے ابھی ارتقائی مراحل طے کرتی نظر آتی ہے۔

موضوعاتی سطح پر بھی اردو شاعری میں دو رجحان غالب نظر آتے ہیں۔ اول: داخلی رجحان جس میں غزل کے تتبع میں عشق و عاشقی، تنہائی و اکلاپے اور جنسی و نفسیاتی مسائل کو مرکز بنایا جاتا ہے۔ دوم: خارجی رجحان جس میں کلاسیکی نظم کے تسلسل

میں کائنات، سماج، فطرت اور تاریخ وغیرہ معروضی حقائق کی روشنی میں ذریعہ اظہار بنتے ہیں۔ آزاد نظم میں اول الذکر موضوعاتی رجحان بہت کم ہے جبکہ ثانی الذکر موضوعاتی رجحان جدید نظم کا ناگزیر تقاضا ہے۔ خاص کر نوے کے آزاد نظم نگاروں کے ہاں یہ واضح دکھائی دیتا ہے۔

تکنیک کے حوالے سے بھی جدید نظم کو عمومی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اول: جس میں نظم اپنے موضوع یا عنوان کے تحت سیدھی لکیر پر چلتی ہوئی یا سادگی سے تفصیل پسندی سے کام لیتی ہوئی اپنے روایتی انجام کی طرف بڑھتی ہے۔ نظیر، آزاد، حالی، اقبال اور احسان دانش کی جدید مگر پابند نظمیں اس کی مثالیں ہیں۔ دوم: جس میں آزاد تلازمہ خیال، شعور کی رو، فلیش بیک، تمثالیت، علامتیت، خوابیت، اشاریت یا دادایت (Dadaism) وغیرہ کی تکنیکیں برتی گئی ہوں۔ یہ تکنیکی رویہ ن م راشد سے ہی نظم میں رواج پانے لگا تھا جبکہ نوے کے آزاد نظم نگاروں تک آتے آتے اس میں بہت پختگی آ گئی ہے۔ گویا جدید نظم سادہ بیانیہ تکنیک سے تہہ دار و پیچیدہ تکنیک کی طرف ارتقا پذیر ہوئی ہے۔

فنی حوالے سے سب سے پہلا کام آزاد نظم کی بحر اور اس کے بنیادی رکن کا تعین ہے جس سے یہ بات جانی جاسکتی ہے کہ یہ آزاد نظم اپنی ساخت و ہئیت میں واقعی آزاد نظم ہے یا کسی معرّیٰ نظم کے مصرعے توڑ کر اسے آزاد نظم کی ہیئیت میں لکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آزاد نظم کا عنوان بہت اہم معاملہ ہے کیونکہ آزاد نظم نظیر، حالی، آزاد یا احسان دانش کی نظموں کی طرح محض اپنے عنوان کی وضاحت یا پھیلاؤ نہیں ہوتیں۔ یعنی آزاد نظم نہ تو عنوان کے کھونٹے سے لٹکا ہوا فن پارہ ہوتا ہے اور نہ ہی اس کا عنوان نظم سے باہر لگی ہوئی کوئی تعارفی تختی ہوتی ہے۔ آزاد نظم میں عنوان نظم کا بنیادی حصہ ہوتا ہے اس لئے ضروری نہیں کہ یہ نظم اپنے عنوان کے بعد شروع ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ نظم کے اختتام کے بعد فوراً عنوان سے رجوع کرنا پڑے۔ آزاد نظم کا عنوان تشبیہی، استعاراتی، علامتی، اساطیری، داستانوی، دیومالائی، تلمیحی، کرداری یا تمثالی انداز کے علاوہ معنی معکوس، مکمل یا نامکمل مصرعہ یا کسی اقتباس کا مکالمے کی صورت میں بھی ہوسکتا ہے۔ گویا عنوان آزاد نظم کی کلید بھی ہوسکتا ہے اور قفل بھی۔ آزاد نظم کے مختلف مصرعوں، حصوں، ٹکڑوں، کانتوز یا استانزوں کی نشاندہی اور ان کے باہمی ربط کی دریافت بھی بہت غور طلب مسئلہ ہے۔ آزاد نظم عام نظموں کی طرح کسی ایک موضوع کے تحت سیدھے سادے انداز میں ایسے نہیں لکھی جاتی کہ آپ اوپر سے نیچے تک پڑھتے ہوئے مسلسل سمجھتے چلیں جائیں۔ آزاد نظم مختلف، اجنبی اور پیچیدہ تکنیکوں میں لکھی جاتی ہے۔ یہ مسلسل بھی ہوسکتی ہے اور اسے مختلف مصرعوں، حصوں، ٹکڑوں یا کانتوز میں بھی تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ضروری نہیں کہ ان مصرعوں، حصوں، ٹکڑوں اور کانتوز کی شاعر خود نشاندہی یا وضاحت کرے بلکہ اسے خود آزاد نظم میں سے دریافت بھی کرنا پڑتا ہے۔ گویا یہاں آزاد نظم کی Drafting یعنی خاکہ نویسی بہت اہم ہے جس کا شعور ابھی تک آزاد نظم کے بہت سے شعراء میں بھی پختہ دکھائی نہیں دیتا۔ مصرعے کو کہاں توڑنا ہے اور کہاں اس کی لکھت کو ختم کر کے دوبارہ کہاں سے شروع کرنا ہے۔ مصرعوں کے مابین کہاں اور کتنا وقفہ دینا ہے۔ یہ سب آزاد نظم نگار اور قاری دونوں کی تربیت کا حصہ ہے۔ کیونکہ مصرعوں کی جوڑ توڑ اور نشست (Placement) درحقیقت آزاد نظم کی معنویت اور تفہیم میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔

ایک اور اہم مسئلہ نظم میں علامتی و استعاراتی نظام کی دریافت بھی ہے چونکہ آزاد نظم روایت کی جبریت سے نجات اور فرد کی تخلیقی آزادی کو اساس بناتی ہے اس لئے اس میں شاعر اپنی ذاتی علامتوں اور استعاروں کو موضوع کی مطابقت میں تشکیل دیتا ہے۔ نت نئی علامتوں، استعاروں، تشبیہوں، تمثالوں کی موضوع سے مطابقت ہی شاعر کے فنی شعور کا پتہ دیتی ہے۔ ان تمام کی دریافت اور معنویت کی تقسیم اور معنوی ربط آزاد نظم کی تدریس میں بہت اہم ہے۔ آزاد نظم کا علامتی استعاراتی نظام اس قدیم، روایتی یا کلاسیکی علامتی استعاراتی نظام سے مختلف ہے جس پر ابلاغ اور معنویت کے حوالے سے عموماً اتفاق رائے پایا جاتا تھا۔ نیا علامتی نظام تخلیق کار ذاتی و انفرادی ہوتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ جدید نظام اپنی تخلیق میں صرف قدیم علامتوں

اور استعاروں کو استعمال کرے مگر ان کی معنویت بدل دے جیسا کہ فیض یا اختر حسین جعفری وغیرہ کے ہاں ہوا۔لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ نظم نگار قدیم اور جدید دونوں علامتوں اور استعاروں کو استعمال کرلے۔لیکن جوں جوں آزاد نظم نگاری آگے بڑھ رہی ہے استعاروں اور علامتوں کا قدیم، روایتی یا کلاسیکی نظام زوال پذیر ہو رہا ہے۔جدیدیت کی انفرادی تخلیقی آزادی اسے انفرادی علامتی و استعاراتی نظام کی تشکیل کی طرف دھکیل رہی ہے لیکن یہ آزاد نظم نگار کے فنی شعور پر منحصر ہے کہ وہ اپنے فن پارے میں موجود انفرادی استعاراتی و علامتی نظام کو کس خوبی کے ساتھ تشکیل و ترتیب دیتا ہے کہ اس میں معنوی ابلاغ کا مسئلہ پیدا نہ ہو اور فہم میں کہیں ابہام نہ در آئے۔تمثال اور تلازمہ ہائے خیال بھی آزاد نظم میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔آزاد نظم کے مرکزی خیال کو متخالف تمثالوں تلازموں کے ذریعے سے اظہار کا لبادہ پہنایا جاتا ہے۔تمام تمثالوں اور تلازموں کی تشکیل و ترتیب اور ان کا باہمی ربط شاعر کے فنی شعور کا پتہ دیتے ہیں۔اس معاملے میں کوتاہی آزاد نظم کے ابلاغ کو برباد کر سکتی ہے اسی لئے آزاد نظم میں تمثال اور تلازمہ ہائے خیال کی معنویت و فہم کا ادراک اس کی تدریس میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔آزاد نظم کا لہجہ اس کی معنوی تفہیم میں بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔طنز، مضحکہ، چوٹ، استفہام، خود کلامی، خطاب، دکھ، اداسی، سرمستی، یاد، خواب، شکستگی، تفاخر وغیرہ جیسے رویے، کیفیات اور احساسات آزاد نظم میں بہت اہم ہیں جو کہ نظم کے لہجے کو متعین کرتے ہیں۔آزاد نظم کی تدریس میں ان کا ابلاغ اور ان کے زیر اثر نظم کی آگہی تفہیم میں ممید ہوتی ہے۔رموز اوقاف آزاد نظم میں بہت اہم ہیں ان کا آغاز ن م راشد کی نظموں میں ہوا تھا مگر اب یہ علامتیں آزاد نظم کا لازمہ بنتی جا رہی ہیں۔وقفہ، سکتہ، واوین، بریکٹ وغیرہ آزاد نظم کی وضاحت میں بہت اہم ہیں۔دوران تدریس ان کی وضاحت اور دوران بلند خوانی وقرأت ان کا اظہار بہت ضروری ہے۔

آزاد نظم کی تکنیک کو کسی طور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔چونکہ آزاد نظم نئے دور کے پیچیدہ و امتزاجی تجربے پر قابو پانے کے لئے ہئیت اور اظہار میں آزادی کا نام ہے جس کی ترجمانی ہئیت اور ہئیت میں موجود تکنیک بھی کرتی ہے۔رئیلزم، دادا ازم، تاثریت، لایعنیت، اظہاریت، شعور کی رو، علامتیت، امیجزم، تجریدیت کے علاوہ آزاد تلازمہ خیال، خود کلامی یا فینٹسی جیسے فنی و ادبی پیرائے اور قرینے بطور تکنیک آزاد نظم میں برتے جاتے ہیں۔آزاد نظم جس نئی جمالیات کی تشکیل کر رہی ہے اس کی بنیاد نئی زبان، تشبیہات، استعارات، علامات، تلمیحات اور اساطیر، دیومالا، کردار، تمثالوں، تلازموں، ٹکڑوں، کانتوز، استانزوں، مصرعوں کی جوڑ توڑ اور نشست (Placement)، لہجوں اور رموز اوقاف وغیرہ کے استعمال پر ہے۔تدریس آزاد نظم میں فنی باریکیوں کی وضاحت کے ساتھ ساتھ ضروری ہے کہ آزاد نظم میں موجود نئے جمالیاتی عناصر کی تفہیم اس انداز سے کی جائے کہ ان کے شعور میں نیا شعری جمالیاتی ڈھانچہ اس طرح سے ترتیب پا جائے کہ طالب علم اس سے حظ اٹھانے کے قابل ہو جائیں۔اس کے لئے ضروری ہے کہ تشبیہ و استعارہ کی حسن کاری، اس کے نظام و ترتیب اور باہمی ربط اور علامتی نظام کی تفہیم، الفاظ کی رعائتوں، تراکیب، تکرار لفظی، اصوات، موسیقیت، منظر نگاری، کردار نگاری، شاعر کے طرز احساس اور آہنگ وغیرہ کی حسن کاری و نشاندہی بطور جمالیاتی عناصر کے بھی کی جائے۔

فکری حوالے سے آزاد نظم کی تفہیم میں سب سے اہم موضوع کی دریافت ہے جسے خارجی اور داخلی دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: خارجی موضوعات سماجی سیاسی، فلسفیانہ، معاشی، اخلاقی، اساطیری، فرد و اجتماع، فرد و ادارہ، فرد و فطرت، فرد و خدا، فرد و کائنات، قومی و اجتماعی وغیرہ جیسے مسائل و تضادات کی وضاحت کرتے ہیں جبکہ داخلی موضوعات قلبی، ذہنی، جنسی، نفسیاتی، شناخت، تنہائی، اجنبیت، بے بسی، عدم تحفظ، وجودیت، امتناع، ارادہ و اختیار، انفرادیت، نرگسیت، سادیت، مساکیت، جبلتِ مرگ، حبطِ عظمت وغیرہ جیسے باطنی مسائل کی ترجمانی کرتے ہیں۔اس حوالے سے موضوع کی وضاحت، اس کی علمی تعریف، پس منظر اور نظم کے تناظر میں اس کا تجزیہ اہم کام ہے جس سے آزاد نظم نگار کی سوچ اور آزاد نظم کے فکری پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔فکری تفہیم میں انفرادی سطح پر شاعر یا فرد کے نفسیاتی و سوانحی عوامل جبکہ اجتماعی سطح پر سماجی سیاسی اور تاریخی و

طبقاتی حوالوں کو بنیاد بنایا جاسکتا ہے۔اس حوالے سے مختلف تنقیدی دبستانوں کے فکری و تجزیاتی رویوں سے بھی مدد لی جاسکتی ہے۔مذکور زاویوں سے آزاد نظم کی تفہیم سے نئے فکری گوشوں اور آفاق تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے اور عصری و تاریخی شعور کی نئی جہتیں پیدا کی جاسکتی ہیں جن کے ذریعے ہم عصر زندگی کی تفہیم اور اس کے چیلنجوں سے نبرد آزما ہونے کی آگہی ممکن ہے۔یہ شعور ان میں عالمی و قومی حوالے سے جدید حسیت کو پروان چڑھانے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔فلسفہ و ادب کے نئے قرینے اور زاویئے نئی اربن رکاسموپولیٹن زندگی کے ترجمان ہوتے ہیں یہی طرز حیات و فکر مستقبل کے ساتھ ہم آہنگی میں معاون ثابت ہوتی ہے۔

آج معاصر جدید نظم آزاد نظم کی صورت میں ایک طویل ارتقا کے بعد غزل کی جبریت سے آزاد ہو کر اپنا انفرادی تشخص بہت حد تک قائم کر چکی ہے۔جدید نظم کا ہیئتی جھکاؤ ۱۹۲۵ء سے ہی آزاد نظم (Free Verse) کی طرف ہونا شروع ہو گیا تھا۔آج آزاد نظم کی ہئیت جدید نظم کی بنیادی پہچان بن چکی ہے۔لیکن آج بھی ہمارے ہاں مجموعی طور پر آزاد نظم تو ایک طرف معٰری نظم نگاری کا رجحان و قبولیت غزل کے مقابلے میں کم ہے۔چونکہ تمام دیگر شعری ہیئتوں پر علامات، تلمیحات و استعارات سے لیکر وزن، بحر، قافیہ، ردیف، تک غزل کی جبریت بطور ایک ''مادر ہئیت'' غالب رہی ہے۔اس لئے ایک وسیع تاریخی پس منظر اور موجود صورتحال کے باعث یہ شعری ہیئت ہمارے اجتماعی لاشعور کا بھی حصہ ہے۔آج بھی آزاد نظم کے مقابلے میں اس کا رجحان قوی اور غالب ہے۔حتٰی کہ فلمی گیت ہوں یا اشتہاری جنگل (jingle)، بچوں کی پہیلی ہو یا شادی بیاہ کا گانا ملی نغمہ ہو یا فوجی ترانہ، کسی کی ہیئت بھی غزل کی جبریت سے آزاد محسوس نہیں ہوتی۔یہی وجہ ہے کہ ہمارے ذہنی تربیت کے بنیادی اداروں یعنی سکول و کالج کے نصابوں میں غزل اور غزلیہ ہیئت کی نظم کے مقابلے میں کبھی آزاد نظم شامل ہی نہیں رہی ہے۔ایسی سیدھی سادی غزلوں اور روایتی نظموں کی تعلیمی تشریح کے ذریعے عشق و عاشقی کی جس معنویت کا فہم طالب علموں کو دیا جاتا ہے وہ نئی شاعری کے تاریخی اور سماجی سیاسی کے علاوہ نفسیاتی اور شاعر کے داخلی آشوب کا عصری شعور پیدا کرنے میں انتہائی ناکام ہے۔حتیٰ کہ نصاب میں کلاسیکی شاعری کے غلبے کے باعث طلبہ میں آزاد نظم کی شاعری تو کیا عام جدید شاعری کا ذوق اور آزاد نظم کی جمالیاتی آگہی ناممکن ہو جاتی ہے۔جس کے باعث طالب علم کو آزاد نظم کی ہیئتی، لسانیاتی، جمالیاتی، فکری اور اظہاراتی تفہیم کا کوئی شعور ہی حاصل نہیں ہوتا۔وہ نثری نظم اور آزاد نظم میں فرق بھی محسوس کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔جبکہ ہمارے ہاں مشاعرے کا زوال پذیر ثقافتی اقدام بھی غزل کو ہی بنیادی اہمیت دیتا ہے۔دوسری طرف صورتحال یہ ہے کہ فارسی کے زیر سایہ پروان چڑھنے والی غزل آج اپنی داخلی و خارجی تاریخی لوازم کے باعث عالمی تو کیا علاقائی سطح کے ادب میں بھی جدید ادب کی ترجمان نہیں بن پا رہی۔آج صرف آزاد نظم ہی ہے جس کے ذریعے اردو شاعری جدید عالمی ادب کے ساتھ اپنا رابطہ استوار کر پائی ہے۔

مارکٹنگ اور سائنس و ٹکنالوجی کے موجودہ عہد میں شاعری کا جواز خود ایک بڑا سوال بن گیا ہے کیونکہ شاعری سے ٹی وی، فریج، پیراسیٹامول کی گولی یا موبائل فون کی طرح کے کوئی بھی فوری فوائد حاصل نہیں کئے جاسکتے جبکہ ریاست اور معاشرہ جس قسم کے اہداف و ترجیحات کو ابھار رہے ہیں۔ان کا نفسیاتی انعکاس مادی فوائد کے علاوہ کچھ اور سوچنے کا کوئی موقع ہی نہیں دے رہا۔گو پاکستانی معاشرہ کلی طور پر ابھی ایسی نہج پر نہیں پہنچا جہاں شعر و ادب کی تخلیق کے لئے ذہنی زرخیزی ہی ختم ہو چکی ہو۔لیکن ہمارے بدلتے ہوئے معاشرے اور ریاستی ترجیحات و انتظام کے نتیجے میں شعر و ادب کی اہمیت نہ ہونے کے برابر سمجھی جانے لگی ہے۔آج شاعر ہمارے نوجوانوں کا ہیرو نہیں رہا اور وہ شاعری کو سماجی آدرشوں میں کوئی بلند مقام دینے کی بجائے محض لمحاتی لطف اندوزی (Intertainment) کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں۔ہمارے نصابات میں عصری تقاضوں اور رجحانات کی متخالف شامل شاعری اپنی قبولیت، دفاع اور حمایت تینوں سے محرومی کا جواز فراہم کر رہی ہے۔لہٰذا آزاد نظم کے بنیادی تدریسی

مقاصد میں جہاں ایک طرف جدید نظم کا فنی وفکری فہم پیدا کرنا ہے وہیں خود اعلیٰ انسانی جمالیات اور اقدار کی ترویج اور انہیں انسان کی گہری ذہنی سطح کا حصہ بنا کر جذبہ واحساس کی پرورداخت اور ان کا طریقۂ اظہار بھی ایک اہم ہدف ہے۔شاعر محض مفکر یا مبلغ نہیں ہوتا اور نہ ہی شاعری محض الفاظ کی محض ترتیبِ نو ہوتی ہے۔شاعری افکار کے ساتھ ساتھ اظہار کا ایک جمالیاتی قرینہ بھی ہے جو جذبہ واحساس اور تخیل کو بنیاد بناتی ہے نہ کہ محض تعقل واستدلال کو۔شاعری کی قرأت اور تدریس کے دوران فکری کے ساتھ ساتھ جمالیاتی تربیت بھی ہوتی ہے جو کہ فرد کو معاشرے کا ایک متوازن رکن بنانے میں اہم کردار کرتی ہے۔

ہمارا نصاب حکومتوں کی سیاسی ضروریات کے پیشِ نظر متعصّبانہ راسخ العقیدگی اور تشدد پسند اعتقاد پرستی کو بنیاد بناتا ہے اس میں ایک معاشرے کو بین الاقوامی ضرورتوں،ثقافتی تقاضوں اور معاصرانہ زندگی کے چیلنجوں کو پورا کرنے کے لیے پائی جانے والی وسعتِ ذہن،تعقل پسندی اور عملیت پسندی(Pregamatism) عنقا ہے۔ایسی نصابی بنیاد ادب وشعر کے لئے انتہائی نامناسب بلکہ تخلیقیت وادبیت کی دشمن ہوتی ہے۔پھر ایسے نصاب پر ہمارا تدریسی وامتحانی طریقہ کار تخلیقی رویوں اور صلاحیتوں کی بربادی کا سبب بنتا ہے۔ادبی فن پارے کو خبروں کی طرح پڑھ کر اس کی غیر جمالیاتی،غیر فلسفیانہ اور مابعد طبعیاتی تشریح،مشکل الفاظ کے معانی اور خلاصہ ومرکزی خیال کی رٹنا تعلیمی عمل کو اس قدر غیر دلچسپ اور میکانکی بنا دیتی ہے کہ طالب علم اور ادبی فن پارے کے مابین ایک ان دیکھی دیوار کھڑی ہو جاتی ہے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ ادب کے تدریسی وامتحانی عمل کی بنیادی تبدیلی کے ساتھ ساتھ نصاب میں جدید رجحانات اور سماجی سیاسی زندگی کی ترجمان ہم عصر شاعری کو نصاب میں شامل کیا جائے جبکہ کلاسیکی شاعری کو گریجویشن کی سطح پر پڑھایا جائے جب طلبا کا شعری ذوق اور فہم پختہ ہو چکا ہو اور طالب علموں میں ادب پارے کے حوالے سے فلسفیانہ غور وخوض کے ساتھ ساتھ شعری محاسن سے لطف اندوزی کو بھی بنیاد بنایا جائے تاکہ ان میں تنقیدی وتخلیقی دونوں جہات ابھریں اور وہ ہم عصر فکر،حسیت،شعور اور جمالیات سے آگاہ ہو کر ادب کی اہمیت وافادیت کو قبول کر سکیں۔آزاد نظم کی تدریس کے ذریعے شعری جمود کو توڑ کر جدید اور عالمی شعری رجحان و جمالیات کی تفہیم و تشکیل کی یہ کاوش ان سرگرمیوں کا تسلسل ہے جسے مولانا محمد حسین آزاد نے کرنل ہالرائیڈ کے حکم پر شروع کیا تھا۔جس کے لیے ضروری ہے کہ نصابات کے علاوہ ادبی وفنی اداروں اور میڈیا کی طرف سے (۱) شاعری کی افادیت،قبولیت، دفاع اور حمایت،(۲) شعری ذوق اور شعر فہمی کی تربیت،(۳) شعری محاسن سے لطف اندوزی اور نئی شاعری کے ذوق اور جدید نظم کی جمالیاتی آگہی،(۴) آزاد نظم کی ہیئتی،لسانیاتی،جمالیاتی،فکری اور اظہاراتی تفہیم کے شعور،(۵) آزاد نظم کے تاریخی اور سماجی سیاسی کے علاوہ نفسیاتی اور شاعر کے داخلی آشوب کے عصری شعور،(۶) اعلیٰ جمالیات اور اقدار کی ترویج،جذبہ واحساس کی پرورداخت اور ان کے طریقۂ اظہار اور (۷) تنقید کے ساتھ ساتھ تخلیقی جہت ابھارنے کو بھی اہمیت دے۔

ماخذات

۱۔ حنیف کیفی، پروفیسر، اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم (ابتدا سے ۱۹۴۷ء تک)، نیو دہلی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۱۹۸۲ء، ص ۴۸

۲۔ ایضاً، ص ۵۲

۳۔ جوزف ٹی شپلی (Joseph T. Shipley), Dictionary of World Literary Terms, لندن، ۱۹۷۰، ص ۱۳۲

۴۔ ہیرس، ایل ایس، (L.S. Harris)، The Nature of English Poetry، لندن، ۱۹۳۷ء، ص ۲۷۳

۵۔ کڈن، جے اے (J. A.Cuddon), Dictionary of literary terms and literary theory، دی پینگوئن، ۱۹۸۲ء، ص ۳۵۵، ۱۰۲۶

۶۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء، ص ۲۰۰

۷۔ ن م راشد، مقالات، مرتبہ، شیما مجید، الحمرا پبلشنگ، اسلام آباد، ۲۰۰۲ء، ص ۴۰۳